نارسیده

مصنف کا نام	وارث کرمانی
ولادت	۱۵ر نومبر ۱۹۲۶ء
وطن	قصبۂ دیوا (اودھ)
تعلیم	ایم۔ اے (انگریزی)
	ایم۔ اے۔ (فارسی)
موجودہ پتہ	لکچرر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مطبع	سرفراز قومی پریس لکھنؤ
طبع اول	۱۹۶۳ء
تعداد	یک ہزار
ناشر	مصنف
قیمت	دو روپے پچاس پیسے

ملنے کا پتہ

دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ

فہرست

کچھ نثر میں

اس شعری مجموعہ میں سنہ ۴۶ء سے سنہ ۶۳ء تک میری تقریباً سترہ سال کی شاعری ہے۔ اس میں وہ ابتدائی نظمیں بھی شامل ہیں جو زیادہ تر حسن و عشق کے موضوعات پر ہیں۔ اس وقت اس قوس قزح کے باہر خیالات کم جاتے تھے۔ اب شعور کا تقاضہ یہ ہوا کہ ان نظموں کو مجموعہ سے خارج کر دیا جائے، لیکن نہ جانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا، ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ میں شاعری میں دماغ کے احکام کی زیادہ پابندی نہیں کرتا، پھر یہ خیال بھی آیا کہ انسان ذہنی طور سے کافی لمبی عمر تک ترقی کرتا رہتا ہے (تاوقتیکہ کوئی خاص حادثے نہ پیش آئیں) اور میری عاقل و بالغ جوانی کی تخلیقات بھی آگے چل کر پایۂ اعتبار سے گر سکتی ہیں۔

اس طرح شاعری کا بہت ہی کم حصہ قابلِ اشاعت قرار پائے گا۔ یہی سب سوچ کر میں نے نیا اور پرانا جتنا بھی مال میرے پاس تھا اس دکان میں سجا دیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے ملاحظہ کرتے وقت مصنف کی عمر اور تجربات کا لحاظ رکھیں گے۔

میں نے اپنی شاعری کی ابتدا فارسی زبان میں کی۔ فارسی ہی کے عظیم شاعروں کو پڑھ کر دل میں شاعری کا شوق پیدا ہوا تھا، چنانچہ اٹھارہ سال سے پچیس سال کی عمر تک مسلسل فارسی میں نظمیں اور غزلیں لکھتا رہا، ان میں سے دو نظمیں یادگار کے طور پر اس مجموعہ میں شامل کر دی ہیں۔ بقیہ کلام اس طرف سے دل برداشتہ ہو جانے کی وجہ سے تلف ہو گیا۔ فارسی شاعروں میں نظامی گنجوی اور حافظ سے مجھے سب سے زیادہ محبت تھی اور اب بھی کافی حد تک باقی ہے۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب مجھے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کرنا پڑا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دیس کے اردو شاعروں کی طرف بھی گزر ہوا تو جذبہ و خیال کے ایک نئے ذائقہ سے شناسائی ہوئی جس کی بنا پر مجھے اپنی پچھلی شاعری کچھ روایتی سی معلوم ہونے لگی اور دلکش بھی کچھ بے جان سا محسوس ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے اپنے اوپر فارسی کلاسکیت کی جکڑبندی کا اندازہ ہوا اور اپنی تازہ رومانیت کے اظہار میں دقت محسوس ہوئی اس وقت سے میں برابر آسان اور بے ساختہ زبان پر عبور حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف رہا ہوں جس میں ابھی تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ ایک فرق ضرور پیدا ہو گیا ہے۔

یہ دو باتیں تو میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کہہ دیں۔ اگر آدمی اپنے عیب خود ہی چپکے سے تسلیم کرلے تو پھر سر بازار رسوائی سے بچ جاتا ہے۔ لیکن ابھی تو ایسی اور بھی خامیاں ہوں گی جن کی مجھے خود بھی خبر نہیں لہٰذا انھیں میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ اب ایک بات اور باقی ہو۔ شاعروں کو محض زبان و بیان کی بات کر کے چھٹی نہیں دی جاسکتی۔ ان سے فکری محاسبہ بھی کیا جاتا ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہ حساب دینے سے قاصر ہوں۔ جہاں تک زندگی کا سوال ہے مجھے اعتراف ہے کہ میں اسے زیادہ سمجھ نہیں پایا۔ تنہائی میں سوچتا ضرور رہتا ہوں کہ یہ زندگی کیا چیز ہے۔ اس کی غرض و غایت کیا ہے اس کی روحانی تعبیر ہونی چاہیے یا مادے کو اس کی بنیاد تصور کرنا چاہیے۔ اس کے برتنے میں علم و اخلاق کا کیا حصہ ہے اور حق و باطل کے کیا معیار و پیمانے ہیں۔ اس پر ہر جگہ یکساں طور سے پورا اترنے والا نیکی اور بدی کا کیا تصور ہو سکتا ہے۔ اس کی فلاح اجتماعی طور سے آگے بڑھنے میں ہے یا اپنی رفتار معکوس کرنے میں۔ اسے ہر قیمت پر منانے اور خوش رکھنے کے لیے اس کے جبر و ستم کی دل خوش کن تاویلیں کرنی چاہئیں یا اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے موت کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور خوشگوار بنانے کے امکانات پر تحقیق کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی باتوں پر میں اکثر بڑے انہماک سے سوچتا ہوں۔ لیکن ایسے موقع پر میری خامی آکر بڑی محبت

مجھ سے درخواست کرتی ہیں کہ تم اکیلے بیٹھ کر ان مسائل پر غور نہ کیا کرو۔ یہ باتیں خطرناک ہوتی ہیں۔ اور میں ان کی خاطر سے اس مہم کو ادھورا چھوڑ دیتا ہوں گویا رازِ حیات مجھ پر منکشف نہیں ہونے پاتا۔ اس تمہید سے جو بات میں آپ تک پہونچانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مجھے حیات و کائنات سے متعلق کسی فکری بصیرت کا دعویٰ نہیں ہے جس کے ابلاغ کے لیے میں شاعری کو اپنا ذریعہ بناتا۔ میں نے اپنی نظمیں اور غزلیں کسی نہ کسی جذبہ کے تحت کہی ہیں لیکن چونکہ انسان کے یہاں جذبات کے ساتھ عقل و فہم کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے جذباتی تجربہ کو خواہ وہ کتنا ہی خالص کیوں نہ ہو غیر شعوری طور سے فکر و خیال کی سرحدوں سے بھی گذرنا ہوتا ہے۔ اور اس لحاظ سے میری شاعری سے بھی اگر کسی فکری عنصر کی تراوش ہو سکتی ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں شاعری سے پیغمبری کرانے کا قائل نہیں۔ یہ تو وہی صاحبِ نظر کر سکتے ہیں جن کا عمل ایمان سے اور ایمان کسی مخصوص آفاقی بصیرت سے ہم آہنگ ہو۔ میری طبیعت شیکسپیر کے ہیلٹ کی طرح عجیب پُرفریب واقع ہوئی ہے۔ کبھی یہ سوچتا ہوں کہ میری شاعری میرے بعد زندہ رہے گی۔ کبھی یہ خیال ستاتا ہے کہ میں نے کوئی قابلِ قدر کام نہیں کیا ہے۔ یہی حال نظریہ کے سلسلے میں بھی ہے۔ میں چاہوں بھی تو اپنے شعری نظریہ کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتا۔ اس معاملہ میں اگر آپ

مجھے صوفی مشرب کہیں تو زیادہ غلط نہ ہوگا، بعض اوقات تمام نظریات و عقائد مجھے فریب معلوم ہوتے ہیں اور اس قدر گریز پا کہ ان پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ احساس صرف میری داخلی کیفیت تک محدود ہے یوں معروضی طور پر میں نے اکثر اس سوال پر غور کیا ہے اور اپنے تاثرات کو ایک مضمون کی شکل میں ادب یا نظریہ کے عنوان سے پیش بھی کر چکا ہوں۔ ایک بات جو میں نے اس مضمون میں کہی تھی اور یہاں دوبارہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ شاعری کے لیے میں کسی بندھے ٹکے نظریہ کو ضروری نہیں سمجھتا، بلکہ مجھے یوں بھی محسوس ہوا ہے کہ اپنے نظریات کا واضح شعور رکھنے والے زیادہ کامیاب شاعر نہیں ہو پاتے۔ اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ میں حال اور ماضی قریب کے ان اردو شاعروں کی مخالفت میں کوئی بات کہہ رہا ہوں جنھیں مقصدی شاعر ہوتے ہوئے بھی نہایت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ادب میں ریاضی کی طرح کسی فارمولے کو بھی یکساں طور سے لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ مستثنیات رہ جاتے ہیں۔ اور اب تو ریاضی اور سائنس میں بھی ایسے مستثنیات نظر آنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ شاعر ایک مخصوص وقت کی پیداوار ہیں جب سیاست سائنس فلسفہ اور مذہب میں انسان کو ایک اطمینانی کیفیت حاصل تھی اس کا خیال تھا کہ تمام کائنات ایک باقاعدہ نظام کے تحت ہے اور اسے عقل کی مدد سے تسخیر کیا جا سکتا ہے۔ آج یہ تصور ختم ہو چکا ہے اور مظاہر

فطرت را ایسا انداز اختیار کر رہے ہیں جسے سمجھنے کے لیے ہر ممکن طریقہ ناکام
ہو رہا ہے۔ ہمارے عہد کی سب سے نمایاں خصوصیت عقل کی شکست ہے۔
سترھویں صدی عیسوی سے لے کر جسے عقلی دور کا آغاز مانا گیا ہے بیسویں صدی
تک کا زمانہ ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے جس پر عقل کی حکمرانی تھی۔ اس عقل
نے ایک طرف مادی حقائق کو سمجھنے اور قابو میں لانے کا کام انجام دیا تو
دوسری طرف روحانی اور مذہبی مسائل کو بھی زیادہ سے زیادہ قابل فہم اور
آسان بنا کر ہمارے لیے قابل اعتماد بنایا۔ جو لوگ ملحد تھے انھیں مادہ پرستی
کی محدود دنیا میں اطمینان حاصل ہوا اور جو لوگ عینیت پسند تھے ان کے
لیے قرون وسطیٰ کے تصور الوہیت کو زیادہ مدلل اور معقول بنا کر روحانی
سکون کا اہتمام کیا۔ موجودہ دور کا المیہ یہ ہے کہ خدا بھی ہم سے چھن چکا ہے
اور عقل بھی ہم کو جواب دے رہی ہے۔ اور ہم گویا بے سروسامانی کے عالم میں
ایک اندھی، بے رحم، بے اصول اور بے حد وحساب طاقت کا مقابلہ
کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انسان نے اسی زمانے میں مادی وسائل کو کام میں
لا کر حیرت انگیز کارنامے انجام دیے ہیں۔ خلا کی بے کراں پہنائیاں ہماری
سیرگاہیں بن گئی ہیں۔ فولاد اور سیمنٹ کی عمارتوں نے ہمارے شہروں کو کھینچ کر
آسمانوں سے ملا دیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان خارجی فتوحات کے
باوجود انسان اپنی ذات کو فتح نہیں کر پایا ہے جس کی وجہ سے اس کے تمام

کارناموں پر پانی پھر جانے کا امکان ہے۔ انسانی سماج پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور تہہ دار ہو چکا ہے جس میں مختلف اور متضاد سیاسی اور معاشی رجحانات ایک دوسرے کی تردید کر کے ایک ہذیانی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ جہاں کوئی بات بھی ایسی نہیں کہی جا سکتی جس کا دوسری طرف سے کاٹ نہ ہوتا ہو۔ پچھلے مفروضات اس تیزی سے باطل ہوئے ہیں کہ کوئی بات فرض ہی نہیں کی جا سکتی۔ کوئی چیز اپنی جگہ ٹھہر ہی نہیں پاتی معانی و مطالب بھاگ رہے ہیں۔ الفاظ گرفت میں آتے آتے اپنا چولا بدل دیتے ہیں۔ اب بتائیے جدید دنیا کے اس ذہنی پس منظر میں ادیب کس چیز پر اپنے فکر و فن کی بنیاد رکھے اور کیسے کسی عقیدے سے مستقل تعلق پیدا کرے ممکن ہے بعض ادیبوں کو یہ انتشار نہ محسوس ہوتا ہو یا وہ ان حالات سے اپنے ذہن میں بہتر تصویر مرتب کر سکتے ہوں۔ اگر ایسا ہے اور انہیں کچھ ایسی قدریں نظر آتی ہیں جن پر تکیہ کیا جا سکتا ہے تو اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بدترین حالات بھی سو فی صدی خراب نہیں ہو سکتے۔ سوال صرف اعتبار کرنے کی ہمت کا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی شاعری کے لیے کسی مقصد کا کھلا ہوا پرچار مناسب نہ ہوگا۔ شاعر کے خیالوں میں اگر تنظیم ہو یعنی اگر اس کے خیالات کا کسی مخصوص نکتہ کی طرف جھکاؤ پایا جاتا ہے تو اسے غالباً پردہ ہی میں رکھنا مناسب ہوگا اس کی تفصیلات فن کی سطح پر نہ آنی

چاہئیں۔ نظریہ یا فکری رجحان فن کے لیے محرک کی حیثیت رکھتا ہے اس کا عمل اندر ہی اندر ہے تو بہتر ہے۔ اور اس کی بھیجی ہوئی چیزوں میں اوپر تک آتے آتے ایک ارتقائی تبدیلی ہو جائے۔ شاعری میں پردہ نشینی کا یہ انداز نیا نہیں ہے۔ مولانا روم نے "سرِ دلبراں" کو 'حدیث دیگراں' کے پیرائے میں ادا کرنے کو 'خوشتر' قرار دیا تھا۔ غالب 'مشاہدۂ حق' کو 'بادہ و ساغر' کی زبان میں بیان کرنا پسند کرتے تھے۔ ہم لوگوں نے بھی اس سنت پر قائم رہ کر دار منصور، سحر شب، لہو چراغ اور نہ جانے کن کن علامتوں سے جدید مطالب ادا کرنے کی کوشش کی اور یہ سمجھے کہ ہم بھی پردہ نشینی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ لیکن اب جدید تر زمانے ہیں یہ علامتیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔ شعر میں انھیں جاتے وقت چاہیے جتنی فن کاری دکھلائیے۔ ان کا گھساپن نہیں جاتا۔ پھر حکمت عملی اور حکمت نظری میں جو تضاد ہمیشہ سے چلا آرہا ہے وہ آج کہیں زیادہ پھیل گیا ہے۔ اور کسی ادیب کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کھل کر اپنے دل کی بات کہہ سکے اور اپنا فنی خلوص قائم رکھ سکے۔ یہ مقصد بھی محض علامتوں اور استعاروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسے کچھ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آپ کا تخلیقی عمل کسی آڑ میں ہو اور اس کی پرچھائیاں باہر کنوس پر نظر آئیں۔ یہ طریقہ قاری کے لیے بھی زیادہ جاذب ہوگا۔ حقیقت کے مقابلے میں اس کا عکس

زیادہ حسین ہوتا ہے اور اس میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" کے ایسے سائے نظر آتے ہیں جو نا آفریدہ اور نارسیدہ ہوتے ہوئے شاعر کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ بات کہیں سے کہیں جا پہونچی۔ میں آپ کے سامنے شاعری کی ایسی باتیں کرنے لگا جن پر میں خود عامل نہیں ہو سکا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ابھی چند سال پہلے تک میری شاعری پر حسن و عشق کے جذبات کا غلبہ رہا ہے اور مجھے ان تجربات سے واسطہ نہیں پڑا جو پورے اعصابی نظام پر ضرب لگا کر دل و دماغ کو مشتعل کرتے ہیں۔ لیکن جن کا اظہار خود ضرب کلیمی کا طالب ہے۔ آخری زمانے کی منظومات ضرور ایسی ہیں جن میں یہ تڑپ پائی جاتی ہے۔ کاش یہ تبدیلی کچھ پہلے ہوئی ہوتی۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آگ کا یہ کھیل مستقبل میں کب تک میں کھیل سکوں گا۔ کامیاب شاعر ہونے کے لیے علاوہ دوسری باتوں کے جسم کی توانائی اور قوت برداشت بھی بہت ضروری ہے۔

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر (نظیری)

وارث کرمانی
مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

۱۰ر مئی ۱۹۶۳ء

اُلفت کا زمانہ

یاد ہے اپنی اُس اُلفت کا زمانا تجھ کو
جب مرے واسطے سب کچھ تھا گوارا تجھ کو
جب مرا نام تھا ہر شام و سحر وردِ زباں
جب مری یاد تھی جینے کا سہارا تجھ کو
وہ مرا دردِ جدائی وہ تمنّا میری
وہ مرے واسطے دن رات تڑپنا تجھ کو
میرے بھیجے ہوئے بوسیدہ خطوں کے پُرزے
دولتِ قیصر و کسریٰ سے زیادہ تجھ کو

میری بدلی ہوئی نظروں سے تباہی تیری
میرے الطاف و عنایات سے جینا تجھ کو
تیرا رو رو کے تغافل کی شکایت کرنا
میرا ہنس ہنس کے وہ تسکین دلانا تجھ کو
مسکراتے ہوئے ہر شخص سے میری باتیں
ذکر بھاتا نہیں تھا اور کسی کا تجھ کو

سنہ ۴۶ء

شباب

مبارک باد اے عہدِ جوانی
کہ ہر لمحہ ہے غرقِ شادمانی
دَمِ عیسیٰ ہواؤں میں نہاں ہے
زمیں رشکِ چہارم آسماں ہے
شمیمِ دوست لاتی ہیں ہوائیں
چمن بر دوش آتی ہیں ہوائیں
یہ حسنِ نازنینانِ سمن بر
یہ شورِ شاہدانِ ماہ پیکر

یہ شیریں کار معشوقوں کا عالم
یہ کوہِ قاف کی پریوں کا عالم
ادائے غمزۂ سیمیں عذاراں
صدائے نغمۂ صوتِ ہزاراں
سرودِ مطربانِ کاشمیری
غزلہائے فغانی و نظیری
خیالوں کے یہ پیکر زرفشاں سے
چلے آتے ہیں کیا جانے کہاں سے
مجھے بھی اے دلِ دیوانہ لے چل
سرِ افلاک بے تابانہ لے چل
جنونِ شوق کی تکمیل کر دے
فضائے حسن میں تحلیل کر دے

سنہ ۲۶ء

هما خاتون

دوش دیدم مه نو را که به آواز حزین
گفت با اختر شب تاب سر عرش برین
کای انیس دل محزون چه توان کرد که من
دیده ام دختر خورشید لقائی به زمین
خیره شد چشم من از تابش حسن خوبش
گشتم آزرده پس از دیدن خورشید چنین
کین حریفی که مرا ردی نمود است امشب
خواهد آورد زوال من مسکین و حزین

گفتم ای موجبِ امواج محیط جوشاں
کیست آں رو کشِ ناہید ثریا تمکیں
گفت در منزلِ فرخندهٔ زہرا حیدر
بوجود آمده از کتمِ عدم دختِ حسیں
ایں دل آویز سخن گوش ز من چوں گشت
خون گلرنگ بجوشید بہ رخسار و جبیں
اشہبِ شوق جہاندم سوی وادی مدیح
کردم آغاز ستائش بہ خیالاتِ حسیں
مرحبا روشنی دیدهٔ اہلِ بینش
حبذا سرو روانِ چمنِ سرورِ دیں
مرحبا ای بہ شبستانِ حسیں جلوه فزای
آفریں ای ز عنایات خدا نغز تریں
حسنِ تو نور دهِ دیدهٔ صاحب نظراں
روی تو داغ دهِ ناصیهٔ ماهِ مبیں

غمزه ات هوشربائی همه خوبان جهاں
خنده ات رونقِ خندیدن گلهائے حسیں
باش ای خامه معجز رقمم اکنوں که کنم
ایں دعای بسوی بارگه عرشِ بریں
تا سراید به فلک نغمهٔ شادی ناهید
تا بود روشنیِ نیّرِ اعظم به زمیں
یارب ایں غنچهٔ نو را که شگفت است امروز
از سرِ مهر نگهدار به دنیا و به دیں
نه دهد جز به تبسم رخ او هیچ نشاں
نه شود آئینهٔ خاطرِ او گردنشیں

سنه ۴۶ء

دعوت

یہ سبزۂ نو خیز یہ گھنگور گھٹائیں
یہ بادۂ گلرنگ یہ مدہوش ہوائیں
یہ سازِ مسرت سے ہم آہنگ نظارے
یہ نشۂ مستی میں شرابور فضائیں
اے یارِ خوش اندام و خوش انداز و خوش آواز
یہ تیری گہر ریز و گہر بیز صدائیں
زلفوں میں لیے غالیہ و مشک کی خوشبو
آنکھوں میں غزالانِ ختن کی سی ادائیں

تجھ کو مرے اس نطقِ گہربار کی سوگند
اس منظرِ شاداب سے آ لطف اٹھائیں
یہ جلتی ہوئی سانس یہ بھکے ہوئے جذبات
آ زیست کو معصوم گناہوں سے سجائیں
آ تازہ کریں رسم و رہِ حافظ و خیام
آ رومی و جامی کا مذاق آج اُڑائیں
یہ رنگِ بہارِ گل و نسریں بھی ہے کیا خوب
آ یومِ بہارِ گل و نسریں بھی منائیں
یہ جام و سبو تیرے ہیں یہ دور ہے تیرا
ہم بھول گئے لیلیٰ و عذرا کی ادائیں
بھر بھر کے قدح ہائے گلاب و مئے گلگوں
اس وادیٔ پُر کیف کو فردوس بنائیں
ہر گھونٹ میں ہو کوثر و تسنیم کی لذت
ہر شے میں کراماتِ مسیحا نظر آئیں

پھر بیٹھ کے اک ساتھ کسی شاخ کے نیچے
ہم اپنی کوئی تازہ غزل تجھ کو سنائیں

۴۷ء

غزل

گاہے مہ و انجم زیرِ نگیں گاہے یہ گماں ہم کچھ بھی نہیں
کچھ اپنی حقیقت سوچتے ہیں کچھ اس کا تبسّم ہوتا ہے
جی بھر کے جفاؤں سے بھی کب وہ لطف اُٹھانے دیتے ہیں
پھر سعیِ کرم فرماتے ہیں پھر دل میں تلاطم ہوتا ہے
سب رنج و الم مٹ جاتا ہے اس سحر بیانی کے صدقے
جب میٹھے میٹھے لفظوں میں اظہارِ ترحم ہوتا ہے
تجھ کو جو تڑپ کر دیکھیں ہم اُٹھ جائے حجابِ دو عالم
ہم اہلِ نظر کا تیرِ نظر جلووں میں کہیں گم ہوتا ہے

پہلے ہی سمجھ کر اے وارث وہ چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں
جب عرضِ شکایت پر میری امکانِ تبسم ہوتا ہے

سنہ ۴۸ء

غزل

نہ وہ حسن و عشق میں ربط ہے نہ وہ زندگی کا نظام ہے
مری خلوتوں کے سکوت میں نہ پیام ہے نہ سلام ہے

وہی ماہ و مہر و نجوم ہیں وہی صبح ہے وہی شام ہے
جو سمانِ نگاہ فروز تھا وہی وجہ سوز دوام ہے

میں پہنچ رہا ہوں رواں دواں تری جستجو میں کہاں کہاں
نہ طلب بشرط حصول ہے نہ سفر بقیدِ مقام ہے

میں کسی سے گرچہ بچھڑ گیا چمن مراد اجڑ گیا
مرے دل کے گوشۂ خاص میں کوئی اب بھی محوِ خرام ہے

گئی نو بہارِ وفا کے ساتھ گئی وہ بہارِ حیات بھی
نہ ضیائے بزمِ نجوم ہے نہ فروغِ ماہِ تمام ہے

سنہ ۴۸ء

تین سال کی ایک بچی

خیالوں میں اک محفلِ انجماں
نگاہوں میں حسنِ غزالِ رمیدہ
وہ جنت کا اک غنچۂ ناشگفتہ
وہ طوبیٰ کا اک میوۂ نارسیدہ
وہ طرزِ تکلم شکستہ شکستہ
وہ مرغِ تخیل پریدہ پریدہ

سنہ ۲۹ء

غزل

محرومیٔ نشاط ہی وجہ فغاں نہیں
غم بھی بقدرِ وسعتِ دل بیاں نہیں
اس غم کی خامشی سے ہیں معمور خلوتیں
جو غم رہینِ منّتِ آہ و فغاں نہیں
برہم ہے کائنات کی ہر چیز تیرے ساتھ
تو مہرباں نہیں تو کوئی مہرباں نہیں
یہ محشرِ ملال یہ اخفائے رازِ غم
آنسو اُبل رہے ہیں اور آنسو رواں نہیں

جلوہ فشاں ہو دل میں شعاعِ جمالِ دوست
تا حدِّ مہر و ماہ اب ایسا مکاں نہیں

۱۹۴۹ء

کشمکش

میری دنیا میں یہ خاموش نگاہی کا جمود
جس میں یوں ہی کبھی اک لہر سی آ جاتی ہے
ایک لمحے کے لیے دل میں اُجالا کر کے
پھر مجھے غم کے اندھیروں میں سُلا جاتی ہے
میری پُرنور دھڑکتی ہوئی راتوں کی رفیق
مجھ کو تاریک فضاؤں میں کہاں چھوڑ گئی
نگہِ خشم آقارب سے ہراساں ہو کر
اپنے ساتھی کو گرفتارِ فغاں چھوڑ گئی

رنجِ ناکامیٔ دل ، برہمیٔ ذوقِ طلب
دیکھ یہ کشمکشِ زیست کا ساماں اے دوست
اک طرف یاس میں ہے جنبشِ مژگاں بھی محال
اک طرف آگ ہے رگ رگ میں فروزاں اے دوست

سنہ ۵۰ء

پرچھائیاں

ہم زمانے میں اس طرح جیتے ہیں اب
ہر نفس مضمحل ہر نظر مضطرب
کوئی تو بات ہے ورنہ کیا بے سبب
سرد ہے میرا دل خشک ہیں تیرے لب
دل میں نشتر کی مانند چبھتا ہے کیوں
مخملیں خواب گاہوں کا عیش و طرب
تیری مخمور آنکھیں جھکیں تو مگر
پھر بھی خالی رہا میرا جام طلب

یہ جدائی کی پرچھائیاں تو نہیں
جو ابھی سے ہے پسِ پردۂ روز و شب

سنہ ۵۰ء

نیا آدمی

ہزار ہا قرن کے بعد آدمی نے سانس لی
اُٹھا نئے مزاج کی حرارتیں لیے ہوئے
جلو میں محشرِ حیات و کائنات موجزن
نظر میں برق و باد کی جسارتیں لیے ہوئے
نکل کے کوہ و دشت سے گزر کے بحر و بر سے
فلک پہ چھا گیا زمیں کی عظمتیں لیے ہوئے
نہ رنگ و خوں سے واسطہ نہ ملک و قوم سے غرض
ہر اک بشر کے واسطے محبتیں لیے ہوئے

طلب کی جد و جہد میں سمندروں کا خلفشار
عمل کے زور و شور میں قیامتیں لیے ہوئے
ستم نصیب خفتگانِ خاک و خوں کے واسطے
حسین حسین خنک خنک بشارتیں لیے ہوئے
تہمتنوں کے تند و تیز ولولوں کے ساتھ ساتھ
سہی قدوں کی گرم گرم الفتیں لیے ہوئے
خروشِ نو کی سرخ سرخ آندھیوں کے دوش پر
حیاتِ نو کی سبز سبز جنّتیں لیے ہوئے
بشر جو کہنہ فلسفوں میں ایک مشتِ خاک تھا
رواں ہے آج بے پناہ وسعتیں لیے ہوئے

سنہ ۱۹۵۰ء

عہدِ رفاقت

ذرا اے مری ہم نفس دیکھنا
ہم آہنگیٔ جذبہائے شباب
تری ہر ادا آتشِ جاں گداز
مرا ہر نفس شعلۂ برق تاب
تری زلف گر ہے شکن در شکن
مری فکر آلودۂ پیچ و تاب
تری آنکھ میں ہے اگر سلسبیل
مری زد میں بھی چشمۂ آفتاب

ترے لب اگر ہیں مئے و انگبیں
مری بات بھی جامِ قند و گلاب
ترا شیوۂ دلبری محترم
مرا دعوئے عاشقی کامیاب
ترے دل میں ہے جذبۂ بے مثال
مرے پاس بھی جرأتِ بے حساب
جو تو سرخوشِ بادۂ حُسن ہے
تو میں بھی ہوں وحشی و مست و خراب
کہیں ہم جو عہدِ رفاقت کریں
بنامِ جہاں سوزیٔ انقلاب
بدل دیں زمانے کی رفتار کو
اُلٹ دیں نظامِ جہانِ خراب

سنہ ۵۱ء

غزل

مری شاہراہِ خیال سے جو وہ ہنس کے آج گذر گئے
مری کائنات کی ظلمتوں میں مہ و نجوم بکھر گئے

یہ ہو اپنا اپنا مزاجِ دل، کوئی مضمحل کوئی مشتعل
تری چشمِ ناز ہو کیوں خجل ترے تیر کام تو کر گئے

یہ سُنا ہو ساقیِ دلستاں ہو کمالِ ضبط فراغ جاں
تری اک نگاہ جو پی گئے وہی اہلِ ظرف نکھر گئے

تری یاد سے بھی عظیم تر ترے حُسن سے بھی لطیف تر
مری زندگی میں کچھ اس مزے کے بھی حادثات گذر گئے

یہ مرے شعور کی وسعتوں میں غمِ حیات کی تیرگی
وہ ترے جمالِ جہاں نما کے حسیں چراغ کدھر گئے
کبھی سعیِ ضبطِ غم و الم کبھی دل تپاں کبھی آنکھ نم
دمِ عرضِ حالِ فراق ہم کئی منزلوں سے گذر گئے

۱۹۵۱ء

جزیرے

سوچتا ہوں کہ ترے غم کے سہارے کے بغیر
اب مسرت میں مسرت کا مزہ مشکل ہے
تجھ سے وابستہ تخیّل کی حدوں کے باہر
اب کوئی حادثۂ روح فزا مشکل ہے
میرے سنگین ارادوں کے فلک بوس محل
تیرے انوار کی گرمی سے پگھل جاتے ہیں
عزمِ آزادیٔ انساں کے ہزاروں خاکے
تیرے انفاس کی خوشبو میں بدل جاتے ہیں

شورشِ کارگہِ زیست اگر سنتا ہوں
تیری آواز سماعت پہ بکھر جاتی ہے
جب بھی دُنیا کے حوادث پہ نظر کرتا ہوں
تیری ہنستی ہوئی تصویر اُبھر آتی ہے
کیا یہی ہے اثرِ ربطِ مسلسل اے دوست
وسعتِ شوق سمٹ کر غمِ اُلفت ہو جائے
ذہن یادِ لب و عارض کے سوا کچھ نہ کرے
ہوش محدودِ شکایاتِ محبّت ہو جائے
اُف یہ گلفام امیدوں کے خیالی فانوس
کب تلک دستِ حوادث سے گریزاں ہوں گے
کب تلک وقت کے بپھرے ہوئے طوفاں کے خلاف
خواب کے تنگ جزیروں پہ چراغاں ہوں گے

سنہ ۱۹۵۱ء

غزل

خستگی میں آج اک بھولی ہوئی یاد آ گئی
جسم کی رگ رگ میں برقِ زندگی لہرا گئی

اے معاذ اللہ یہ میری گذرگاہِ حیات
بارہا اس راستے میں موت ٹھوکر کھا گئی

روز افزوں ہے بلائے تو بہ توُ کا اہتمام
دل کے عالم سے جفائے یار بھی گھبرا گئی

رات فرطِ شوق میں دل نے یہ اُن سے کیا کہا
آنکھ تاروں نے جھکالی کہکشاں شرما گئی

ہر مسرت ہے اسیرِ حلقۂ دامِ بلا
جب مصیبت آ پڑے سمجھو مسرت آ گئی
مشرق و مغرب پہ بڑھ کر چھا گیا قحطِ دمشق
مشرق و مغرب میں شکلِ عاشقی دھندلا گئی

۱۹۵۲ء

غزل

اک حقیقت ہو نہ وجہ خلشِ دل ہو جائے
زندگی نغمۂ آرام میں غافل ہو جائے

مجھ کو واماندگیِ شوق میں محسوس ہوا
جیسے خود عمرِ رواں پا بہ سلاسل ہو جائے

تیرا اندوہ ہے اس طرح شریکِ افکار
جیسے نغمہ شبِ مہتاب میں شامل ہو جائے

بارہا میں نے حقائق سے نگاہیں پھیریں
کہ ترے حسن کا پندار نہ باطل ہو جائے

میری تخئیل ہے اقصائے دو عالم پہ محیط
میں جو چاہوں مری تنہائی بھی محفل ہو جائے

یوں مجھے کیف میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے نہ دیکھ
کہ اسی سرمہ فشاں چھاؤں میں منزل ہو جائے

اُف وہ آنسو جو ٹپک جائے سرِ دامنِ دست
ہائے وہ موج جو آسودۂ ساحل ہو جائے

سنہ ۵۲ء

اردو کی آواز

اے وطن اے مرے شفیق وطن
اے حسیں جلوہ گاہِ گنگ و جمن
اے گلستانِ علم و فضل و کمال
اے بہشتِ شرابِ شعر و سخن
اے صداقت کی درس گاہِ قدیم
اے محبت کی سر زمینِ کہن
تیری سر سبز راہ سے گذرے
کتنے لشکر کشانِ روئیں تن

تیری معصوم خاک سے اُٹھے
کتنے پیغمبرانِ جہل شکن
تجھ میں پل کر جواں ہوئے اب تک
کتنے اخلاق و دین و علم و فن
تیری عظمت کا گیت گاتے ہیں
کوہ و دریا و بحر و دشت و دمن
آج تک مسکرائے جاتے ہیں
تیری تہذیب کے حسیں گلشن

تو نے ایرانیوں کو پیار کیا
تو نے مغلوں کو ہم کنار کیا

اہلِ یورپ کو سلطنت دے دی
اجنبیوں پہ اعتبار کیا
فارسی، سنسکرت، انگریزی
تو نے ہر لہجہ اختیار کیا

مہرباں ہو کے آج ہندی کو
تو نے اپنے گلے کا ہار کیا
تامل و مرہٹی و پنجابی
سب کو اپنی جگہ شمار کیا
لیکن اے مادرِ وطن تو نے
اپنی اردو کو دل فگار کیا

مجھ کو دشمن ہدف بنا کے چلے
تیغ و خنجر اٹھا اٹھا کے چلے

میری زلفوں میں جو اسیر رہے
مجھ پہ وہ پیچ و تاب کھا کے چلے
دشمنوں سے تو کیا گلہ ہوتا
مہرباں بھی نظر بچا کے چلے
مجھ سے اب دور بھاگنے والے
مجھ سے کتنا قریب آ کے چلے

جن سے امید چارہ سازی تھی
زخم دل پر وہی لگا کے چلے
جرعہ خوارانِ میکدہ میرے
مجھ کو جامِ اجل پلا کے چلے

دامنِ صبر تار تار ہے آج
شاعری درد کی پکار ہے آج

آتش و میر سر بہ زانو ہیں
خاکِ سرشار بے قرار ہے آج
مضطرب ہے پریم چند کی رُوح
چشمِ اقبال خوں فشار ہے آج
تاجدارِ سخنورانِ غالب
مرغِ بسمل تہِ مزار ہے آج
مرگئی روحِ نغمۂ فطرت
ارضِ کشمیر سوگوار ہے آج

لٹ گئی کائنات حسن و جمال
روضۂ تاج اشک بار ہے آج
مٹ گئی ملک و قوم کی عظمت
سرنگوں حسن کوہسار ہے آج
اُٹھ گئی رونق جہاں آباد
سینۂ لکھنؤ فگار ہے آج
درس علم و ہُنر دیا میں نے
ذوق فکر و نظر دیا میں نے
جنگ کی خار زار راہوں میں
امن کا راہبر دیا میں نے
خود غرض تاجروں کا سرمایہ
نذر جمہور کر دیا میں نے
خواب میں اونگھتے غلاموں کو
سوز برق و شرر دیا میں نے

11065

وقت کے سرد آبگینوں میں
تلخ زہر آب بھر دیا میں نے
حسنِ فطرت کے ترجمانوں کو
لحنِ مرغِ سحر دیا میں نے
ماہ پاروں کے گوشِ گردن کو
حسنِ نعل و گہر دیا میں نے

کیا کروں شرحِ دردِ پنہانی
تنگ ہے عرصۂ سخندانی

وسعتِ رنج و غم میں ڈوب گئی
حدِ پروازِ فکرِ انسانی
لے گئی کھینچ کر کہاں مجھ کو
میرے جذبات کی فراوانی
بات پہنچے نہ غیر لوگوں تک
رنگ لائے نہ گریہ سامانی

اپنے گھر کی ہنسی اڑانا ہے
تاکجا شکوۂ ستم رانی
اے وطن تیری خاک ہے مجھ کو
مایۂ انبساطِ روحانی
تیرے دشت و جبل کے دامن میں
گونج اُٹھی مری غزل خوانی
میرا مٹنا تو کچھ نہیں لیکن
ہائے تیری یہ خانہ ویرانی

سنہ ۵۳ء

رازِ سخن

کیا خبر تجھ کو یونہی سادہ ملاقات تری
کتنے مشکوک خیالوں کو جگا دیتی ہے
کتنے طوفاں مرے سینے میں اٹھا دیتی ہے
کوئی نقطہ ہے جہاں تجھ سے ہراساں ہوں میں
بیدل و بے نظر و بے سر و ساماں ہوں میں
میرے آنے پہ وہ پر کیف تبسم تیرا
جس میں مجھ کو نظر آتے ہیں ہزاروں پہلو
جس میں اخلاق، ترحم نظر آتا ہے مجھے

فاتحانہ سا تکلم نظر آتا ہے مجھے
میں یہ ڈرتا ہوں کہ بے وجہ ملاقاتوں سے
میرے جذبات کی شورش تجھے معلوم نہ ہو
نرم و شیریں سے تقاضائے غزل خوانی پر
میں بہت دور بہت دور پہنچ جاتا ہوں
کہ مرے شعر کا مخزن تجھے معلوم نہ ہو
کہ مری فکر کی الجھن تجھے معلوم نہ ہو
میری بہکی ہوئی آواز نہ غمّاز بنے
میرا اندازِ نظر تجھ سے نہ سازش کرلے
تو یونہی حقِ سماعت کو ادا کرتی ہے
تجھ سے میں دادِ سخن پا کے تڑپ جاتا ہوں
ایسے چبھتے ہوئے ہوتے ہیں سوالات ترے
رُوحِ تخلیق کے سینے میں لرز جاتی ہے
تیرے بیتاب تجسس کی ضیا پاش کرن

خلوتِ غم کے قریب آ کے گذر جاتی ہے
اور پھر تیرے خیالات بھٹک جاتے ہیں
میری تخئیل کی پرواز میں کھو جاتے ہیں
وجد آتا ہے تجھے ذہن کی نقاشی پر
جھوم جھوم اٹھتی ہے تو میری گہرپاشی پر
تیری نظروں کی خطابت ترے لہجہ کی مٹھاس
میری آواز کو نغموں میں سمو دیتی ہے
میرے الفاظ ترنم میں پرو دیتی ہے
جوشِ تسنیم میں ہر شعر ڈبو دیتی ہے
سالہا سال رہا ربطِ مسلسل تجھ سے
تو مگر آج تلک رازِ سخن پا نہ سکی
لاکھ مشاطگیٔ نقد و نظر کی تو نے
میرے افکار کے گیسو کبھی سلجھا نہ سکی

۱۹۵۲ء

آج کا سفر

دنیا عجب جنون میں گرمِ سفر ہے آج
کیا اعتبارِ گردشِ شام و سحر ہے آج
جنبش میں آ چکی ہیں صفیں کارزار کی
عالم تمام عرصۂ تیغ و تبر ہے آج
اہلِ وغا کے نعرۂ گردوں شگاف سے
آوازِ سازِ امن و اماں بے اثر ہے آج
اُڑنے کو ہیں فضا میں پہاڑوں کی دھجیاں
مٹنے کو امتیازِ حدِ بحر و بر ہے آج

آلاتِ حرب چیخ رہے ہیں برہنہ سر
انساں شکار کرگسِ بے بال و پر ہے آج
توپیں گرج گرج کے یہ کہتی ہیں وقت سے
انساں کی داستان بہت مختصر ہے آج
اُمڈا ہوا ہے ایک سمندر خدا بچائے
دود و کف و بخار بہ حدِّ نظر ہے آج

۵۲ء

قطعہ

تخیلات دلفروز سے حجاب کب تلک
تجلیات نو بہ نو سے اجتناب کب تلک
حقیقتیں نقاب اُٹھائے ہنس رہی ہیں سامنے
توہمات کے جہاں میں محو خواب کب تلک

بادِ صبا سے

(بہ یادِ حافظ)

اے صبا نکہتِ گیسوئے معنبر لانا
کوئی تحفہ گل و نسریں سے بھی خوشتر لانا
شبنمستانِ محبت کی حسیں راہوں سے
خنکیِ شبنم و نورِ مہ و اختر لانا
جاں بلب ہیں ترے مشتاق سرِ راہِ حیات
دمِ عیسیٰ و مئے لعل و گلِ تر لانا
عشق ہو مست و غزلخوان و صراحی بردوش
زندگی تازہ و سرشار و معطر لانا

درخورِ محفل و شایانِ خراباتِ مغاں
آتشیں مطرب و بے باک نوا گر لانا
تجھ کو اندوہِ اسیرانِ قفس کی سوگند
آرزوؤں کے حسیں پھول کھلا کر لانا
حُسن ہی حُسن کا ساماں تری راہ میں ہو
حُسن ہی حُسن کے انوار سراسر لانا
کشتگانِ ستمِ دورِ خزاں ہیں ہم لوگ
اپنے ہمراہ بہاروں کا پیمبر لانا
اس نئے دور کے شعروں میں تغزل کم ہو
میری افتادِ طبیعت کا سخنور لانا

سنہ ۱۹۵۳ء

غزل

شعلۂ غم چراغِ وفا ہو گیا
راہزن بھی مجھے رہنما ہو گیا
تیرے توبہ شکن حُسن کے دور میں
آدمی آدمی سے خفا ہو گیا
مایۂ زندگی ہے تری آرزو
ساز کیا جس سے نغمہ جدا ہو گیا
چلتے چلتے یہ کس کا خیال آ گیا
تا بہ منزل سفر خوشنما ہو گیا

آگ لگ جائے اس جرأت شوق کو
کوئی گل پوشش عرقِ حیا ہو گیا
ایک دل ہم نوا تھا غمِ عشق میں
وہ بھی کم بخت نا آشنا ہو گیا
کتنی طاقت رُبا تھی نظر عشق کی
حسن بھی مبتلائے وفا ہو گیا

۱۹۵۳ء

غزل

دردِ دل سوزِ جگر دودِ الم ہی تک ہے
چاک دامانیٔ وحشت شبِ غم ہی تک ہے

لاکھ شائستگیٔ طرزِ ستم ہو رنگیں
آتش انگیزیٔ احساسِ ستم ہی تک ہے

عاشقی آنکھ سے ہے خونِ جگر کی طالب
رسم و راہِ غمِ دل دیدۂ نم ہی تک ہے

کچھ ہمیں اہلِ خرابات سمجھ سکتے ہیں
یوں تو واعظ کی تگ و تاز حرم ہی تک ہے

اس عنایت سے غمِ ہجر گوارا ہم کو
دوست سے ربط جو دشمن کے کرم ہی تک ہے

ہم اسیرانِ محبت کی زباں بند نہ کر
خیر سے بات ابھی شرحِ الم ہی تک ہے

اضطرابِ دلِ وحشی کو کہاں لے جائیں
عرصۂ فکر بھی ہستی سے عدم ہی تک ہے

کون ہوگا ہدفِ ناوکِ خوباں وارثؔ
یہ جسارت یہ جنوں آپ کے دم ہی تک ہے

۵۳ء

شادی کے بعد

میری بیوی مری ہمدم مری نصف بہتر
ایک لمحہ بھی نہیں اس کو بھروسہ مجھ پر

میری بے راہ روی وجہ پریشانی ہے
کیا کرے مجھ پہ وہ مجبور ستم رانی ہے

میرے ذوقِ طرب آگیں سے شکایت ہوئے
میری شیرینیٔ گفتار سے نفرت ہے اُسے

میرے وہ شعر جنھیں روحِ محبت کہیے
نازشِ زمزمۂ کوثر جنت کہیے

انھیں شعروں کے لیے مجھ سے خفا رہتی ہے
جاں بر افروختہ و شعلہ بہ پا رہتی ہے
جب کبھی رنگین مزاجی کا کچھ اظہار کیا
قہر آلود نگاہوں سے وہیں وار کیا
ہر قدم پرسشِ اعمالِ تمنا کا خیال
ایسی صورت میں ہو کیا تربیتِ ذوقِ جمال
اس کا مقصد ہے غمِ زیست بڑھاتے جائیں
خاک میں دل کی امنگوں کو ملاتے جائیں
نہ جوانی کی بہاریں نہ محبت کا رباب
نہ تبسم نہ ترنم نہ تغزل نہ شراب
لیکن اس تلخ اذیت میں تہہِ دامِ حیات
آج بھی ہوں میں وہی جرعہ کشِ جامِ حیات
آج بھی دعوتِ خوباں پہ مچل جاتا ہوں
اپنی بیوی کی قلمرو سے نکل جاتا ہوں

آج بھی زیست کے افکار سے بیگانہ ہوں
آج بھی زخمہ زنِ سازِ صنم خانہ ہوں
آج بھی شیفتۂ وضع طرحداری ہوں
آج بھی تابعِ آدابِ گنہگاری ہوں
ماہ سیماؤں سے دزدیدہ نگاہی ہے وہی
کج کلاہی ہے وہی شوخ مزاجی ہے وہی
میری معصوم شریکِ غمِ دوراں بیگم
مجھ کو کرتی رہی پابندِ روایاتِ حرم
میں مگر مائلِ خوبانِ گل اندام رہا
غرق صہبائے جواں مستیٔ اصنام رہا
عمر بھر مجھ کو رہی شوخ نظاروں کی تلاش
مرغزاروں کی شرابوں کی بہاروں کی تلاش
دل نے آوارۂ تاتارِ غزالاں رکھا
شوق نے گامزنِ شہرِ حسیناں رکھا

۱۹۵۴ء

تاج محل

ایک خوابیدہ و مخمور و پر اسرار محل
سنگِ مرمر میں محبّت کا تخیّل جیسے
میٹھے میٹھے غمِ ہجراں کا تسلسل جیسے
چاندنی رات میں بہکا ہوا رنگین خیال
جیسے ٹھہرے ہوئے نغمات کا سیمیں آنچل
جیسے شیراز کی پیمانہ در آغوش غزل
گورگانی خلشِ غم کی جنوں خیز تراش
جیسے چنگیز کے بھٹکے ہوئے رومان کا خواب

جیسے مریخ کی آغوش میں زہرا کا رباب
شہسوارانِ سمرقند کا خوں ریز جلال
ڈھل گیا الفت و اخلاص کے پیمانوں میں
سو گیا وادیِ جمنا کے خیابانوں میں

۱۹۵۳ء

غزل

جمالِ نسترنی رنگ و بوئے یاسمنی
گلوں نے سیکھ لیا تم سے ذوقِ پیرہنی

زمانہ ساز نہ ہو گر بتوں کی سیم تنی
تو عزمِ بت شکنی بھی ہے عین برہمنی

سوادِ کوہ و بیاباں میں شامِ بے وطنی
ہمیں لبھا کے کہاں لائے آہوئے ختنی

ہزار رنگ میں پنہاں ہے آرزوئے حیات
دُعائے نیم شبی تا جنونِ کوہ کنی

بنامِ دولتِ حسن و جمالِ بے پایاں
سمجھ کے کیجئے اہلِ طلب کی دلشکنی

مجالِ آہ نہ تھی دل کو بزمِ جاناں میں
یہ احتیاط بھی تھی مقتضائے گل بدنی

وہ رنجِ راہِ تمنا میں یادِ یارِ عزیز
وہ دور بجتے ہوئے سے ربابِ انجمنی

۵۳ء

اکتوبر کا مہینہ

مژدہ اے دل کہ ماہِ اکتوبر
لے کے آیا ہے فصلِ نو کی خبر
دوست ہمدرد مہرباں آیا
راحتِ دل نشاطِ جاں آیا
ایک محشر چھپا ہے فطرت میں
زندگی رونما ہے فطرت میں
تخمِ گندم شکست کھاتا ہے
بطنِ گیتی میں کسمساتا ہے

رائی چپکے سے سر اُٹھاتی ہے
جو نمی پا کے مُسکراتی ہے
جان پڑنے کی سب میں آہٹ ہے
اک پُر اسرار سنسناہٹ ہے
کاروبارِ نمو کمال پہ ہے
طولِ روز و شب اعتدال پہ ہے
نکھری نکھری فضا میں ہے ہر سو
ہلکی ہلکی پیال کی خوشبو
دھوپ نکھری ہوئی ہوا شاداب
سبز باغات نقرئی تالاب
بیل کھیتوں میں ہل چلاتے ہیں
کونٹر پر کونٹر بنتے جاتے ہیں
ہر طرف فصل کی بوائی ہے
قحط اور بھوک پر چڑھائی ہے

سچ جو پوچھو اناج کا گھر ہے
یہ جہینہ غریب پرور ہے
مست ہیں باغبان کشت وطن
آہنیں پشت سنگلاخ بدن
ہاتھ ہے ہل پہ سر جھکائے ہیں
اپنی محنت سے لو لگائے ہیں
کاش چھا جائے یہ فضا بڑھ کر
اسلحہ ساز کارخانوں پر
روح تیغ و تفنگ سو جائے
ساری دنیا کسان ہو جائے

۱۹۵۲ء

غزل

نوا سنجِ غم و آلام کیوں ہو
محبت وقفِ طرزِ عام کیوں ہو

شہیدِ نرگسِ مستانہ ہے دل
خرابِ بادۂ ہر جام کیوں ہو

یہی جب تیرہ بختی ہے تو ظالم
ترے ہی گیسوؤں کی شام کیوں ہو

کچھ اس میں سازشِ اغیار بھی ہے
تغافل پیشگی کا نام کیوں ہو

جہاں نظروں میں ہے تاریک ساقی
غروبِ آفتابِ جام کیوں ہو
ارے او منکرِ رسمِ وفا سن
کوئی یوں ہی اسیرِ دام کیوں ہو
وہ جب خود ہیں سراپا دعوتِ شوق
تو وارثؔ موردِ الزام کیوں ہو

۵۴ء

سراپا

مجھے تجھ سے دعوائے الفت نہیں
مرے دل میں تیری محبت نہیں
نہ تیری جدائی میں روتا ہوں میں
نہ اشکوں سے دامن بھگوتا ہوں میں
نہ یہ آرزو تجھ کو حاصل کروں
تری ذات کو اپنی منزل کروں
مگر اے سراپا نشاط و سرور
کوئی تجھ سے ربط نہاں ہے ضرور

جسے آج تک میں نہ سمجھا سکا
تجھے بات دل کی نہ بتلا سکا
کئی بار بھر پیام و سلام
بڑھا تیری جانب بصد اہتمام
بصد دعوئ طاقت شاعری
بصد کرّ و فرّ زباں آوری
کوئی جیسے جنگ آزمائی کرے
کسی سلطنت پر چڑھائی کرے
مگر ٹوٹ جاتا ہے تیرے حضور
مرے زعم باطل کا سارا غرور
مجھے رہزن نقد جاں بھی ملے
حسینان ابرو کماں بھی ملے
بڑے کافروں سے ملاقات کی
بڑے کجکلاہوں سے بھی بات کی

مگر تیری آنکھیں مگر تیرے لب
ترے نرم اعضا کا جوشِ طرب
تری انکھڑیوں کا گلابی خمار
ترے حسن کی ارغوانی فضا
ادا شیوۂ دلخراشی لیے
حیا روحِ کشمیر و کاشی لیے
وہ ملبوس کا دل رُبا انتخاب
تنِ ناز غرقِ شراب و گلاب
وہ روئے حسیں خلدِ جاں شمعِ دل
وہ آنکھیں سکرِ خواب سے مضمحل
وہ جسمِ جواں برقِ صبر و سکوں
جوانی کی یلغار سے لالہ گوں
ز سرتا قدم معدنِ لعل و سنگ
ہمہ زیور و زر ہمہ آب و رنگ

تجھے شعر و نغمہ کا سنگم کہوں
تری ذات کو موجِ زمزم کہوں
مرا بس چلے قید کر لوں تجھے
تغزل کے شیشوں میں بھر لوں تجھے
سدا یادگارِ جوانی رہے
تری دلکشی غیر فانی رہے

۱۹۵۴-۵۶ء

غزل

آج جب رات گئے چاند لبِ بام آیا
خلوتِ شب میں بڑی دور سے پیغام آیا
مصلحت شاملِ تعزیرِ غمِ عشق رہی
ہم سرِ دار گئے غنچہ تہِ دام آیا
عمر بھر خوفِ جدائی نے پریشاں رکھا
عشق میں طالعِ بیدار بھی کس کام آیا
آنکھ خوں بار ہوئی غنچۂ دل کھلنے لگا
موجِ گل آئی کہ ہونٹوں پہ ترا نام آیا

سنہ ۵۲ء

ہونٹوں پہ ہنسی رُخ پہ حیا یاد رہے گی

ہونٹوں پہ ہنسی رخ پہ حیا یاد رہے گی
اے حسن تری شوخ ادا یاد رہے گی
اظہارِ عنایات کی مخصوص فضا میں
اصرارِ محبت کی خطا یاد رہے گی
وہ شب وہ چمن زار وہ بے ہوش گھٹائیں
وہ جھوم کے چلنے کی ادا یاد رہے گی
جذبات کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے کونین
وہ بے خودیٔ ارض و سما یاد رہے گی

امڈے ہوئے طوفانِ محبت کے مقابل
چھائی ہوئی ساون کی گھٹا یاد رہے گی

وہ شب ہمہ شب سلسلۂ عرضِ تمنّا
وہ شوق کی وسعت بخدا یاد رہے گی

احسانِ مسیحا نفسی چین نہ دے گا
آزارِ محبت کی دوا یاد رہے گی

انفاس کا جادو نہ کبھی دل سے مٹے گا
ملبوس کی خوشبوئے حنا یاد رہے گی

پلکوں سے نمِ کوثر و زمزم کی تراوش
چہرے پہ محبت کی ضیا یاد رہے گی

اک خنجرِ سمن پوش و گل اندام کے ہاتھوں
آغوش میں مرنے کی دعا یاد رہے گی

اک شاعرِ آوارۂ اقلیمِ اودھ کو
اُس رات کی اک بات سدا یاد رہے گی

جولائی ۵۵ء

نازشِ دودمانِ کرمانی

مژدہ اے تشنگانِ شہرِ سخن
پھر خراماں ہے ابرِ نیسانی
لے کے طوفانِ برق و باد اُٹھی
میرے لہجہ کی دجلہ سامانی
محوِ آرائشِ خیال ہے پھر
میری کلکِ گہر کی جولانی
کتنی پیشانیوں کو مجھ سے ملی
زہرہ و مشتری کی تابانی

کتنی آنکھوں کو بخش دی میں نے
وحشتِ آہوئے ختن سامانی
میرے طرزِ سخن میں زمزمہ خواں
روحِ خیام و ذہنِ خاقانی
میری گلکاریوں سے ہے تعبیر
ورنہ کیا نقشِ آذر و مانی
میری رامشگری سے جھوم اٹھی
بزمِ ناہید کی غزل خوانی
صاحبِ افسر و کلاہ ہوں میں
فاتحِ کشورِ سخن دانی
وارثِ تختِ دلّی و شیراز
نازشِ دودمانِ کرمانی

سنہ ۱۹۵۶ء

تخلیق

نیلگوں وسعتِ افلاک کی پہنائی میں
کھول دیتا ہے خیالوں کے دریچے کوئی
وقت کے جسم سے خوشبوئے وفا آتی ہے
رات بھر دامنِ یوسف کی ہوا آتی ہے
وہ اُبھرتے ہوئے امید کے زرّیں مینار
وہ چراغوں کی قطاریں وہ مرادوں کی برات
دامنِ دل پہ حسیناؤں کا گل ریز خرام
مہرباں حسن کی خلوت میں تمنا کے سلام

ساقیِ زہرہ جبیں جام بکف اُٹھتے ہیں
مطربِ ہوش رُبا باندھ کے صف اُٹھتے ہیں
خستہ حالوں کو سُلاتے ہیں حنائی آغوش
آشناؤں کی نظر گردِ سفر دھوتی ہے
ذوقِ تخلیق لیے آتی ہے لیلائے سخن
سنبل و لالہ نگاہوں میں بکھر جاتے ہیں
وہ اُفق تا بہ اُفق وادیٔ ایمن کا جمال
وہ تخیّل کی سبکدوشِ غنائی پرواز

تھک گئی آنکھ تو کھلنے لگے لمحات کے جسم
میرے لمحات کی خوشبو کو گرفتار کرو
میرے احساس کی نزہت لیے جاتا ہے کوئی
دوستو محتسبِ فن کو خبردار کرو

میرے نغموں کا جواں ساز نہ جلنے پائے
میرے گیتوں کے حسیں خواب پہ اصرار کرو
یہ مرے شیشہ و مرمر کے دل آویز محل
یہ تصاویر یہ خاکے یہ سنہرے پیکر
دیکھتے دیکھتے سب خاک میں مل جائیں گے
در و دیوار سے رونے کی صدا آئے گی
نیلگوں وسعتِ افلاک کی پہنائی سے
وحشتِ دیدہ و دل برہنہ پا آئے گی

سنہ ۱۹۵۰ء

شہنشاہ ایران اور ملکہ ثریا کے لکھنؤ آنے پر

سحر گہ چو خورشید فرخ تبار
خبر کرد از آمد شہریار
سر سر فرازاں بر آمد ز خواب
فتح یاب شد بر سکون اضطراب
پریدند مرغاں سوئے لالہ زار
در آمد بہ جنبش ہوائے بہار
بروں ز آشیاں عندلیباں شدند
ز ہر سو بہ گلشن غزلخواں شدند

بدل گفتم اے خسرو نامدار
نثارت کنم لولوئے شاہوار
فشانم لآلی چو ابر بہار
سرایم بہ گلشن چو صوت ہزار
ز اشعار خود گل بداماں شوم
وزاں پس بسویت شتاباں شوم
زگاندھی و اکبر رسانم سلام
ز تاج و اجنتا گذارم پیام
کنم تازہ در دل ہماں رسم و راہ
خورم بادہ بر یاد عباس شاہ
سپاس خدائے جہاں آفریں
کہ از رحمت آورد روزِ چنیں
کہ امروز شد جان و دل شادماں
برآمد مراد دلِ دوستاں

ببیں ملکۂ شاہ دیں آمدہ
ثریا بسیر زمیں آمدہ
بصورت حسین و ببالا بلند
بدیدار خوشرد بہ گفتار قند
بہ گیسو مسلسل بہ پیکر گلاب
بہ سیرت فرشتہ بروآفتاب
حسیں تر ز حوران لالہ عذار
سبک تر ز خوشبوی فصل بہار
ہزار آفریں بر چنیں انتخاب
کہ خود را در عالم ندارد جواب
من از صدقِ دل ایں دعا میکنم
بدرگاہِ حق التجا میکنم
کہ آں حسن خوبش بکام تو باد
معطر ز بویش مشام تو باد

تو سر سبز بادا دریں گلستاں
جوان باد بختت زماں تا زماں
سبکدوش و مسرور و دلشاد باد
ز رنج و غم و محنت آزاد باد

سنہ ۵۶ء

مہاتما گاندھی

ہے ترے پیغام سے روشن نظامِ کائنات
ایشیا کو مژدۂ راحت رساں تجھ سے ملا
آہن و الماس کے آتش فشاں بازار میں
آدمی کو پرچمِ امن و اماں تجھ سے ملا
تیرے جسمِ ناتواں میں بجلیاں روپوش تھیں
خستہ حالوں کو نیا عزمِ جواں تجھ سے ملا
عاشقانِ صبحِ آزادی کو شامِ ہجر میں
ضبطِ غم، زورِ عمل، ذوقِ فغاں تجھ سے ملا

پھر زمانے کو اشوک و گوتم و اکبر کے بعد
ہند کی دیرینہ عظمت کا نشاں تجھ سے ملا
تیرا اعجازِ نظر پیغمبری سے کم نہ تھا
معتقد ہو کر گیا جو بدگماں تجھ سے ملا
اختلافِ اہلِ شیخ و برہمن کو بارہا
ارتباطِ حسنِ ناقوس و اذاں تجھ سے ملا
جس طرف اُٹھے قدم جلنے لگے لاکھوں چراغ
رہگزاروں کو جمالِ کہکشاں تجھ سے ملا
تیرے مرشد عیسیٰ و عثمان و حلاج و حسین
سب کا آخر رشتۂ تسلیمِ جاں تجھ سے ملا
ہم نے مانا راہِ غم میں یاس و محرومی بھی ہے
کوئی ایسا راہزن لیکن کہاں تجھ سے ملا
مرحبا اے ساقیِ میخانۂ گنگ و جمن
اہلِ عالم کو نیا ہندوستاں تجھ سے ملا

۵۶ء

نذرِ ایشیا

خبر دی کسی نے سپہرِ روم
ہوا ہے بہت دشمنوں کا ہجوم
جہازوں پہ اہلِ فرنگ آئے ہیں
بجاتے ہوئے طبلِ جنگ آئے ہیں
دلِ مہر و مریخ لرزاں کیے
زمیں توڑ دینے کا ساماں کیے
شہنشاہیت ان کو یاد آئی ہے
بڑے کشت و خوں کی قسم کھائی ہے

اٹھا وادیِ نیل میں اضطراب
بڑھی اور کچھ شورشِ انقلاب
جواں آرزوئیں مچلنے لگیں
عقابی نگاہیں بدلنے لگیں
تہمتن جوانوں کو یکبارگی
امیرِ عساکر نے آواز دی
کہ لینا خبردار جانے نہ پائیں
یہ گستاخ پھر سر اٹھانے نہ پائیں
کہن سال لاغر بدن بھیڑیئے
چلے ہیں ہمیں لوٹنے کے لیے
ذرا شہ جو پائی تو سر چڑھ گئے
یہ کم ظرف اب اس قدر بڑھ گئے
زر و سیم نے بدزباں کر دیا
تمول نے یوں بے عناں کر دیا

کہ شیروں سے نظریں ملانے لگے
دلیروں سے زور آزمانے لگے
اٹھو تیغ زہر آب دم کھینچ لو
زمیں سرخ کر دو علم کھینچ لو
یہ منظر بھی زاغ و زغن دیکھ لیں
جواں شاہبازوں کا رن دیکھ لیں
تشدّد کا ہر دیوتا کانپ اُٹھے
سزا ہو وہ نام سزا کانپ اُٹھے
یہ سنتے ہی سب سر بکف ہو گئے
تہمتن جواں صف بہ صف ہو گئے
نگاہوں میں شعلے بھڑکنے لگے
دل و دست و بازو پھڑکنے لگے
حفاظت میں لاکھوں سنانیں اُٹھیں
خدنگوں کو لے کر کمانیں اُٹھیں

عرب شہسواروں کے لشکر چلے
پرانے بہادر جھپٹ کر چلے
سعودی جواں مشتعل ہو گئے
عراق و عجم ایک دل ہو گئے
لیے صبح جمہوریت کا نشاں
سے چلے ازبک و تاجیک و ترکماں
نبرد آزما سرفروشانِ ہند
جواں شیر مردانِ پنجاب و سند
چڑھانے لگے غیظ میں آستیں
لرزنے لگے آسمان و زمیں
رفاقت کی اک موج لہرا گئی
عَلَم ایشیا کی گھٹا چھا گئی
یہ طوفاں جو دیکھا اُمنڈتا ہوا
جنونِ محبت میں دل چیخ اُٹھا

؎ تہذیبی اعتبار سے مصر اور افریقہ کے بہت سے حصوں کو ایشیا کا جزو سمجھنا چاہیے۔

سلام اے وطن اے حسیں ایشیا
سلام اے مقدس زمیں ایشیا
سلام اے دیارِ مذاہب سلام
سلام اے خیال و خرد کے امام
ترا ذرّہ ذرّہ ہے عزت مآب
کہاں ہے تری عظمتوں کا جواب
طلسمِ عروج و زوالِ بشر
چھپائے ہوئے ہیں ترے دشت و در
بجز تیرے دُنیا میں کس کو ملے
پہاڑوں کے ایسے قوی سلسلے
یہ صنّاعیِ دستِ آدم کہاں
یہ زربفت و کمخواب و ریشم کہاں
کہاں اور ہیں اے نگارِ وطن
یہ لعلِ بدخشاں یہ مشکِ ختن

دلوں کو بھاتی ہے بے اختیار
تری وادیوں کی نشیلی بہار

مبارک ترا عہدِ برنائی ہے
رگوں میں نئی زندگی آئی ہے

ترے صف شکن نوجواں جاگ اُٹھے
ترے حُسن کے پاسباں جاگ اُٹھے

حسیں بحر کاہل سے تا مصر و روس
رواں ہے ترے ارتقا کا جلوس

مگر اے وطن اے بہشتِ بریں
ابھی آتشِ دشمنی کم نہیں

سُنا ہے کہ نیلے سمندر کے پار
کوئی قوم ہے بر سرِ اقتدار

جہاں پیچ کھاتے ہیں شعلوں کے ناگ
پگھلتا ہے لوہا اُبلتی ہے آگ

ہلائے ہے دھرتی مشینوں کا زور
گرجتے ہوئے کارخانوں کا شور
ہواؤں میں عفریت اڑیں پرفشاں
لیے آگ کی نیلگوں چھتریاں
وہ شعلے وہ بجلی وہ دود و دخاں
وہ تخریب کے تجربے الاماں
دھماکوں سے کوہِ گراں ہل گئے
زمیں ہل گئی آسماں ہل گئے
جھلسنے لگی ہے زباں اے دہن
نہ سن حال دورِ جہاں اے وطن
مجھے بادۂ امنِ عالم پلا
پلا جامِ زردشت و گوتم پلا
نئے دور میں لا شرابِ کہن
بیادِ غزالانِ نازک بدن

حیں خائف ہوں کے در کھول دے
مقاماتِ قلب و نظر کھول دے
کہاں گل فشاں ہیں بتا اے وطن
ترے زعفرانوں کے رنگیں چمن
ہواؤں کو خوشبو سے معمور کر
پہاڑوں کو پھر ایمن و طور کر
یکایک فضا تھرتھرانے لگی
اک آواز کانوں میں آنے لگی
یہ آواز ہر دشت و در سے اٹھی
تواریخ کی رہ گزر سے اٹھی
خرد گاہِ بغداد و نالندہ سے
ہمالہ و البرز و الوند سے
زمان و مکاں سے گزرتی ہوئی
ہزاروں برس پار کرتی ہوئی

ترنم کی اک موج گلگوں لیے
دم راوی و نیل و جیحوں لیے
ہجوم سفر سے گراں بار سی
تماشائے عالم سے بیزار سی
اس آواز نے جیسے مجھ سے کہا
کہ اے نوجواں شاعر خوش نوا
بدلتی ہو جب زندگی دم بہ دم
خیالوں کی واماندگی ہے ستم
ستاتا ہے کیوں تجھ کو اے خستہ حال
کسی دشمنی و دوستی کا خیال
نیا طرز علم و خبر چاہیے
تجھے انقلاب نظر چاہیے
رواں رو ہے منزل بہ منزل حیات
اُجڑنا منازل سے ہے سخت بات

بہت یاد آئیں گے وقتِ سفر
نگارانِ گل پوش و زرّیں کمر
محبت نہ چھوڑے گی بندِ قبا
گلے مل کے روئے گی روحِ وفا
وہ رسمِ کہن وہ صنم بھول جا
وفاداریوں کی قسم بھول جا
نیا غنچۂ آرزو کر قبول
گرا دے عقیدت کے پژمردہ پھول
مذاقِ قدامت پرستی بدل
شعورِ بلندی و پستی بدل
گزرگاہِ تیغ و سناں چھوڑ دے
خیالاتِ سود و زیاں چھوڑ دے
صداقت کا جذبِ نظر آزما
حوادث میں تابِ جگر آزما

یہ مانا ہے ایک طوفان یہ
مگر اہلِ مغرب بھی انسان ہیں
وہ محرومِ دردِ بشر تو نہیں
غلط بیں سہی بے نظر تو نہیں
وہاں بھی دھڑکتے ہوئے بے خبر
دلِ ہومر و چاسر و مولیئر
نہ بھول اے ہجومِ بلا میں اسیر
مقدس ہے انسانیت کا ضمیر
سیہ کار ہو لاکھ ذہن و دماغ
اندھیرے میں روشن ہے یہ شبچراغ
نہاں خانۂ دل میں ہے عکس ریز
جنونِ جسارت سے گرم ستیز
حرارت سے اس کی گریزاں ہو موت
ہراساں و ترساں و لرزاں ہو موت

دمِ عیسیٰ و مصطفیٰ ہے یہی
مرے رہبروں کا خدا ہے یہی
اسی سے چمن در چمن ہے حیات
ازل تا ابد موجزن ہے حیات

سنہ ۱۹۵۶ء

غزل

اس چشم مے گوں کا پیام
شیشہ بہ شیشہ جام بہ جام
گرمیِ یادِ یار نہ پوچھ
جلنے لگیں شمعیں سرِبام
جب سے کوئی شرما کے گیا
غرقِ حیا ہیں صبح و شام
آہ وہ چشمِ عشق نواز
رہبرِ عشق غضب آلام

ایک شکستہ مستوں کی طرف
اے صنم لغزیدہ خرام

۱۹۵۸ء

غزل

جذبۂ عشق کا معیارِ وفا ہی کیوں ہو
یوں اگر ہو تو محبت میں مزا ہی کیوں ہو

گا سے گا ہے تپشِ سوزِ دروں بھی لے دل
ہے گنہگار تو معتوبِ خدا ہی کیوں ہو

اُن کو یہ فکر کہ ہر درد کا درماں بن جائیں
ہم کو یہ غم کوئی مجبورِ دوا ہی کیوں ہو

اس قدر ہیبتِ اربابِ جفا بھی کیا ہو
فکرِ ناقص کے لیے فن کی گواہی کیوں ہو

ہم تو کہتے تھے نہ شعلوں سے لپٹنا وارث
اب رہِ عشق میں احساس تباہی کیوں ہو

سنہ ۷۵ء

غزل

لاکھ ناداں ہیں مگر اتنی سزا بھی نہ ملے
چارہ سازوں کو مری شامِ بلا بھی نہ ملے
حسرت آ گئیں تو ہے ناکامیٔ منزل لیکن
لطف تو جب ہو کہ خود اپنا پتا بھی نہ ملے
کچھ نگاہوں سے غمِ دل کی خبر ملتی ہے
ورنہ ہم وہ ہیں کہ باتوں سے ہوا بھی نہ ملے
خواہشِ داد رسی کیا ہو ستمگر سے جہاں
آنکھ میں شائبۂ عذرِ جفا بھی نہ ملے

اس قدر قحطِ بصیرت بھی نہیں اے واعظ
ہم بتوں کے لیے نکلیں تو خدا بھی نہ ملے

عشق وہ عرصۂ پر خار ہے ہمدم کہ جہاں
زندگی راس نہ آئے تو قضا بھی نہ ملے

دل میں آتا ہے کسی شمعِ تمنا کا خیال
ظلمتِ شب میں جب انجم کی ضیا بھی نہ ملے

کیا قیامت ہے طبیعت کی روانی وارث
کوئی ڈھونڈے تو نشانِ کفِ پا بھی نہ ملے

سنہ ۱۹۵۶ء

اے پیرِ خرابات

اے ساقیِ میخانہ ولے پیرِ خرابات
ہیں منتظرِ حکم ترے ارض و سماوات
جب تو نے کیا اُٹھ کے نئے دور کا آغاز
محکوم ہوئے روز و شب ساعت و لمحات
کافور ہوئی ہیبت رنج و غم و آلام
مجبور ہوئی طاقتِ ناسازیِ حالات
اے ساقیِ میخانہ ولے پیرِ مغاں دیکھ
ہر دل میں مچلتے ہوئے تعمیر کے جذبات

ہر سر میں سمایا ہوا سودائے ترقی
ہر ذہن پہ چھائے ہوئے جاں بخش خیالات
آنکھوں میں فروزاں ہیں نئے جوش کی شمعیں
ہے ارضِ وطن رشکِ بساطِ فلکیات
جمہور کی اک فوجِ ظفر موج رواں ہے
ہاتھوں میں لیے پرچمِ انصاف و مساوات
تیشوں نے پہاڑوں کا جگر کاٹ دیا ہے
اب رہگذرِ عام ہیں دیرینہ طلسمات
تدبیر نے دریاؤں کا رُخ موڑ دیا ہے
ویرانے ہیں تا حدِّ نظر زیرِ نباتات
اک غلغلۂ فتح و ظفر گونج رہا ہے
ہیں زمزمہ پرداز نقیبانِ فتوحات
ملنے ہی کو ہے گوہرِ مقصودِ تمنّا
اُٹھنے ہی کو ہیں شاہدِ گیتی کے حجابات

ہاں سلسلۂ جہد و عمل اور ابھی اور
وہ سامنے ہیں منزلِ مقصد کے نشانات

سنہ ۵۶ء

ایک شرر

عمر کی اس عجیب منزل پر
عقل منڈلا رہی ہے جب دل پر
یاد آتا ہے وہ کرشمۂ ناز
وہ محبت کا شرمگیں آغاز
عنفوانِ شباب تھا ہم پر
گھر میں سب کا عتاب تھا ہم پر
اس خطا پر کہ ہم میں الفت تھی
سب عزیزوں کو ہم سے وحشت تھی

اس تڑپ میں کہ ہوں بہم دونوں
رات بھر جاگتے تھے ہم دونوں
میری نظریں جو گدگداتی تھیں
بھاگ کر تم ہنسی چھپاتی تھیں
کیا ہوا وہ نشاطِ عہدِ وصال
کچھ تو بتلا نگارِ مہرِ جمال
کس نے لوٹے وہ صبح و شام بتا
کیوں ہوئی زندگی حرام بتا
دل ہے اب اور رنج و غم کا حباب
فکرِ فردا سے مضمحل اعصاب
عرصۂ زندگی میں خاک بہ سر
دوڑتا پھر رہا ہوں شام و سحر
لیکن اس کاروبار میں اکثر
ناچ اٹھتا ہے دل میں ایک شرر

لاکھ دھندلا گیا ہے ذوقِ جمال
لطف دیتا ہے اب بھی ایک خیال
رات جب چاندنی میں گھر والے
خوابِ شیریں کے لوٹتے ہیں مزے
یاد چھپ کر تمھاری آتی ہے
ایک خوشبو سی پھیل جاتی ہے
روح محوِ خیال ہوتی ہے
رات غرقِ جمال ہوتی ہے
کبھی آ کر یہ زندگی دیکھو
میرے آنگن کی خامشی دیکھو

۱۹۵۸ء

غزل

سوالِ شوق کبھی ہو شوق ناگوار بھی ہے
عجیب شوخ طبیعت نگاہِ یار بھی ہے
جنوں کی فصل میں کیا ضبطِ شوق کی تاکید
یہ پوچھئے کہ ہمیں دل پہ اختیار بھی ہے
صبا کے دوش پہ آتے ہیں شاخِ گل کے سلام
خزاں میں شائبۂ قربتِ بہار بھی ہے
ہمیں کو خون رلاتی ہے ورنہ اے ناصح
وہ چشمِ ناز محبت کی پاسدار بھی ہے

ہجومِ عارض و گیسو میں کوئی شے گم ہے
اس اختلاط کے عالم میں انتشار بھی ہے

ہم اس سے کیا گلۂ سوزِ غم کریں ہمدم
یہ غم اسی کے تصور سے خوشگوار بھی ہے

ہماری چھیڑ بتوں سے یونہی نہیں واعظ
کچھ اپنی حسن پرستی پہ اعتبار بھی ہے

سنہ ۵۸ء

غزل

فکرِ سخن میں رات جو یاد آگیا کوئی
تنہائیوں میں پھول سے برسا گیا کوئی

تا دیر چشمِ شوق میں کھلتے رہے گلاب
اک خلدِ جاں فروز میں پہنچا گیا کوئی

وہ حلقہ ہائے زلفِ شکن در شکن نہ پوچھ
گیسو تمام رات پہ بکھرا گیا کوئی

وہ پیرہن کی عطر فشانی قدم قدم
عالمِ خرامِ ناز سے مہکا گیا کوئی

کیا کیا نہ آئے ذہن میں کافر تصوّرات
کیا کیا نہ علم و عقل کو بہکا گیا کوئی

نظروں میں جھلملاتی رہی دور تک فضا
اک چاندنی سی راہ میں چھلکا گیا کوئی

اے ہم نشیں نہ پوچھ بہ ایں طرزِ اجتناب
کیا کیا کرم نہ عشق پہ فرما گیا کوئی

میری غزل نے لوٹ لیے شہرِ مہر و ماہ
میری غزل پہ فتح مگر پا گیا کوئی

سنہ ۵۸ء

خراب آباد

میں نے با دیدۂ تر
ایک دن اس گلِ رعنا سے کہا
جب یہ ثابت ہے کہ اس نرگسِ شہلا کے سوا
کوئی زمزم کوئی تسنیم نہیں
جب یہ ظاہر ہے کہ اس عارضِ رنگیں کے سوا
اس خرابے میں کوئی چیز نہیں وجہِ سکوں
ایک بازارِ قیامت ہے جہاں
سر چھپانے کو زمیں ہے نہ زماں

اپنے بڑھتے ہوئے ادراک کے صحراؤں میں
رینگتی پھرتی ہے کیڑوں کی طرح نسلِ بشر
کوئی منزل ہو نہ منزل کا نشاں
جب یہ عالم ہو تو اے جانِ جہاں
کیوں نہ دنیا کو تہِ گیسوئے پرخم کر دوں
اور اس حسن کی رنگین بہاروں میں نہاں ہوں
یہ جو پیشانیِ سیمیں پہ ہے نازک سی شکن
یہ شکن نظمِ دو عالم تہ و بالا کر دے
ان نگاہوں کے اشاروں پہ بصد عجز و نیاز
فاتحِ سلطنتِ روم و فرنگ
دل و جاں پیش کش وعدۂ فردا کر دے
اس حسین جنبشِ لب پر بخدا شیخِ زماں
چاک کرتا ہوا دستارِ فضیلت آئے
اور غرقِ مے و مینا کر دے

آہ یہ شوخیِ رفتار یہ ایں قامتِ ناز
قبر سے رقص کناں حافظ شیراز اٹھے
نذر قدموں پہ سمرقند و بخارا کر دے
دیکھ لے جانِ حیات
کب سے ہے خوابِ امیدوں کی برات
خیمہ زن ہو لب و عارض کے قریب
ہرزہ ہے مصلحت دانش و دیں
جھوٹ ہو زہد و عبادت کا طلسم
پاکیٔ دامن و تقدیسِ حیا کچھ بھی نہیں
علم و آگاہی و ایمان و وفا کچھ بھی نہیں
خیر و شر کچھ بھی نہیں سہو و خطا کچھ بھی نہیں
اس زمانے میں کوئی شے بخدا کچھ بھی نہیں
علم و اخلاق کے پردے میں ستم جاری ہے
وہی تہذیب وہی دورِ الم جاری ہے

آہ یہ علم و عمل کیا ہوگا
کوئی یہ علم و عمل نذرِ جہنّم کردے
کوئی اس محفلِ اصنام کو برہم کردے

سنہ ۵۹ء

غزل

یہ قدم قدم کشاکش دلِ بیقرار کیا ہے
جو یقیں نہ ہو عمل پر تو نشاط کار کیا ہے
یہ نظر کے ساتھ جلوے سے نہ نقاب کیوں ہیں
یہ سوادِ چشم و عارض پہ حسیں غبار کیا ہے
بخدا نسیم گلشن تری وحشتوں کے صدقے
یہ مزاج نامہ بر ہے تو مزاج یار کیا ہے
وہ کرم نہ ہو ستم ہو کوئی بات کم سے کم ہو
یہ ادائے بے نیازی مرے غم گسار کیا ہے

یہ ہم اہلِ غم کی منزل ہے دبے قدم گزر جا
کہ اجل یہاں کے نقشوں میں ترا شمار کیا ہے

ابھی آ کے نغمۂ دل کی بہار دیکھ جاؤ
میں نوائے خود شکن ہوں مرا اعتبار کیا ہے

کبھی ہم نیازمندوں سے کبھی آپ پوچھ لیتے
کہ یہ دردِ عشق کیوں ہے کہ یہ حالِ زار کیا ہے

سنہ ۵۹ء

ندیمِ تنہائی

اے صبا اے ندیمِ تنہائی ایک مدت کی رازداں تو ہے
ان پریشانیوں کے عالم میں ہم غریبوں پہ مہرباں تو ہے
تیرے گیتوں کی نرم موسیقی بارہا رنج و غم میں کام آئی
بارہا آرزو کے گلشن میں تو نوید شگفتگی لائی
جس کی خوشبو سے عطر بیز ہے تو اس مسیحا نفس کا نام تو لے
شہرِ بلقیس کی حسیں قاصد دلِ پرشوق کا سلام تو لے
کون اب نیم باز آنکھوں میں نیند آباد کرنے آتا ہے
شب کی تنہائیوں میں کس کا خیال دل کو رہ رہ کے گدگداتا ہے

یاد ہوگا تجھے وہ عہدِ حسیں جب بہاروں سے ہمکنار تھے ہم
وہ محبت کا گلفشاں موسم جس کے سائے میں نغمہ بار تھے ہم
وہ نگاہوں کی شرمسار ادا وہ جھکتی ہوئی ملاقاتیں
وہ تبسم کی جلوہ ریزی سے جگمگائی ہوئی حسیں راتیں
دور رہ کر بھی نارسائی میں دل کو اک انتظار سا کیا تھا
ہر طرف جنبشِ نگاہ کے ساتھ عکسِ رخسارِ یار سا کیا تھا
کیوں وہ پہلی سی روشنی نہ رہی ماہ و خورشید کے خزانے میں
خوش نگاہی کے پرفریب صنم سو گئے کس نگار خانے میں
اے صبا اے ندیمِ تنہائی آج جی بھر کے تجھ کو پیار کریں
نغمۂ دل سُنا سُنا کے تجھے خاطرِ یارِ غمگسار کریں

سنہ ۶۰ء

سوزِ ہنر

علم کے اے مدعیِ علم نوازی کے ساتھ
کاش تجھے مل سکے دیدۂ بیدار بھی

بادہ گساروں میں تھے کام و دہن کے غلام
تو جنھیں سمجھا کیا محرمِ اسرار بھی

حسن پرستی کا شوق اہلِ ہوس کو بھی ہے
حسن پرستی مگر کام ہے دشوار بھی

ایک جھلک پر جہاں لاکھ حجابات ہوں
ایسی جگہ کیا کرے طالبِ دیدار بھی

نورِ بصیرت کہاں سوزِ درونِ کے بغیر
روشنیٔ شمع ہے شمع کا آزار بھی

علم کا مقصد نہیں جسم کی آسودگی
علم کی پہچان ہے زردیٔ رخسار بھی

سینۂ اہلِ وفا مشرقِ صد جلوہ ہو
شعلۂ جاں سوز بھی مطلعِ انوار بھی

راہِ جنوں میں تجھے دولتِ دل کیا ملے
تیرے جنوں میں رہی مصلحتِ کار بھی

شوق اگر ہے تو ڈھونڈھ مدح نگاروں سے دور
تیرے زمانے میں ہیں رومی و عطار بھی

سنہ ۱۹۶۱ء

غزل

کیا ذوقِ عرفاں کیا فکرِ عالی
دل ہی اگر ہو الفت سے خالی
اس چشم و لب کی ممنونِ احساں
شیریں بیانی نازک خیالی
دنیا میں اب تک جینا نہ آیا
جب بھی اٹھے ہم اک چوٹ کھالی
یاروں نے کیا کیا چرچے کیے ہیں
سُن کر ہماری آشفتہ حالی

حرف طلب پر وہ کچھ نہ بولے
بس مسکرا کے گردن جھکا لی
تیری ادا نے اسے گل شمائل
کتنے گلوں کی عزت بچا لی
ابرو ہیں خنجر نظریں ہیں صہبا
اک اصفہانی اک پرتگالی
ہمدم وہ اس کی دلدار نظریں
احسان کر کے شرمانے والی
میری تباہی اس سے نہ کہنا
اس نے ستم کی قیمت ہی کیا لی
اس نقش پا نے راہوں میں اکثر
باغ ارم کی بنیاد ڈالی
وارث نے آخر اسلام تج کر
کوئے بتاں میں دھونی رما لی

۱۹۶۲ء

ایک کرن

جانے وہ چاند کا پرتو تھا کہ تاروں کی ضیا
یا کسی ننھے سے دیپک کا سنہرا آنچل
یا کسی گوہرِ نایاب کے دل کی دھڑکن
اک کرن دل کے اندھیرے میں کئی سال ہوئے
ذوقِ تزئینِ در و بام لیے آئی تھی
کچھ زمانہ کے لیے ہنسنے لگا غم خانہ
روشنی پھیل گئی فرش پہ دیواروں پر
لبِ سوزاں نے مسرت کے ترانے گائے

کتنے شمشاد قد و غنچہ دہن یاد آئے
اس اُجالے نے نیا شہر بسایا دل میں
اک کرن سے کئی سورج ہوئے پیدا دل میں
جانے پھر کیوں وہی پرنور دل آویز کرن
خود بخود زرد سی ہونے لگی دھیرے دھیرے
میں نے اس کو دلِ وحشی کی حرارت بخشی
خونِ دل خونِ جگر اس کی رگوں میں دے کر
اپنے افکار کی پوشیدہ تمازت بخشی
اس کو تنہائی میں رو رو کے بہت سمجھایا
اے کرن اپنے نہاں خانے سے بیزار نہ ہو
تو نے اس اجڑے ہوئے گھر پہ کرم فرمایا
اب اسے یوں نہ مٹا خانہ بر انداز نہ ہو
کیوں مری ضد میں خود اپنے پہ ستم کرتی ہے
رحم کر اپنی مسیحائی پہ بیمار نہ ہو

دل کے ویرانے میں اک دھوم تری ذات سے ہے
دیکھ ناداں یہ چمک ترک نہ کر زرد نہ ہو
تیری عظمت تری پہچان اسی بات سے ہے
یہ کرن پر مری فریاد کو سنتی ہی نہیں
جانے کس بات پہ کس جرم پہ ناخوش ہو کر
روشنی دل کی بجھا دینے پہ آمادہ ہے

مارچ ۱۹۶۳ء

گلاب کا پھول

کسی گلشن میں اک گلاب کا پھول
جس کو دعوائے رنگ و بو تھا بہت
درسِ حسن و جمال دیتا تھا
علم میں ذوقِ جستجو تھا بہت
باغ کے تازہ نونہالوں سے
اس کو سودائے گفتگو تھا بہت
اس کے جذبات کی ادا تھی حسین
اس کی ہر بات میں غلو تھا بہت

اک کمیں گاہ کے اندھیرے سے
ناگہاں رہزنوں کا وار ہوا
ایک نشتر لگا رگِ جاں پر
ایک خنجر جگر کے پار ہوا
خسروِ گلستاں زمیں پہ گرا
سینۂ رنگ و بو فگار ہوا
باغ کے رہزنوں نے ہنس کے کہا
کہ چلو اک حسیں شکار ہوا
کچھ لرزتے ہوئے سے ہاتھ بڑھے
نافۂ رنگ و بو چرانے کو
سب کی نظریں بچا کے گلشن میں
لے گئے پھول کے خزانے کو
کوئی دیکھے رفوگری ان کی
زخم پھر سل گیا دکھانے کو

پھر وہی رنگِ دلربائی ہے
پھر وہی لب ہیں مسکرانے کو
کسی گلشن میں اک گلاب کا پھول
جس کو دعوائے رنگ و بو تھا بہت
آج اس سوچ میں پریشاں ہے
اپنی روداد کس زباں سے کہے
اس کے زعمِ خودی پہ کیا گزری
کس طرح اہلِ گلستاں سے کہے

دل میں جب وہ شرار ہی نہ رہا
اہلِ گلشن میں قدر کیا ہوگی
سبزہ بیگانہ وار دیکھے گا
بادِ مشکیں گریز پا ہوگی
چشمِ نرگس سے خون ٹپکے گا
لبِ سوسن پہ بد دعا ہوگی

نکہتیں تیر بن کے آئیں گی
شاخِ گل خنجر آزما ہو گی
کسی گلشن میں اک گلاب کا پھول
جس کو دعوائے رنگ و بو تھا بہت
آج اس سوچ میں پریشاں ہے
کیوں نہ اس زندگی کو ٹھکرا کر
رہزنوں کے گروہ سے مل جائے

مارچ ۱۹۶۳ء

"خاموش آگ"

وقت کی ڈور عہد ماضی سے
جلتے جلتے یہاں تک آئی ہے
آگ کی اس لپیٹ میں آکر
ان گنت روز و ماہ و سال جلے
کتنے تارے خلا میں سرد ہوئے
کتنے مریخ و آفتاب جلے
کتنے شہروں کی راکھ بھی نہ رہی
کتنے ایوان و تخت و تاج جلے

ذوق رعنائیٔ نگاہ جلا
خواب آرائشِ حیات جلے
لہلہاتے ہوئے چمن اُجڑے
مسکراتے ہوئے گلاب جلے
خیر و شر کی عمارتیں لے کر
زندگی کے تصورات جلے
آگہی کے فریب میں آکر
دل جلے غم جلا دماغ جلے
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے نگاہ
زندگی کے قمار خانے پر
کہیں جینے کا شور برپا ہے
کہیں مرنے کی آہ و زاری ہے
آدمی مچھلیاں چرند پرند
سب میں اک مار کاٹ جاری ہے

ایک کی خود غرض طبیعت پر
دوسرے کا وجود بھاری ہے
چھوڑ دینے میں اپنی جان کا ڈر
مار لینے میں رستگاری ہے
آج جو دست و پا تمھارے ہیں
کل انھیں سے غذا ہماری ہے
کرگسوں کی اُداس محفل میں
لب و عارض کے خوان اُترتے ہیں
دیوتاؤں کے سنگدل جرگے
زرد یرقاں زدہ سے شہروں کو
چیرتے پھاڑتے گزرتے ہیں
جا بجا کچھ مسافروں کے گروہ
منجمد ہوگئے ہیں رستوں پر
سرد ہوتے ہوئے یگوں کی راکھ

تہہ بہ تہہ جم گئی ہے ڈھانچوں پر
اینٹھ کر رہ گئی ہیں آوازیں
تھرتھرائے ہوئے ہونٹوں پر

۶۲ء

شرنارتھی

کچھ درخت آگہی کے صحرا میں
چپ کھڑے ہیں جلے ہوئے باہم
جن سے چمٹی ہوئی ہے اک مخلوق
کھوکھلے نیم جاں درختوں کی
پسلیاں ہل رہی ہیں سانس کے ساتھ
آگ چھائی ہوئی ہے ہر جانب
جل رہے ہیں شجر مگر خاموش
کوئی فریاد بھی نہیں کرتا

کوئی فریاد رس نہیں ملتا
آگ کے اس بھرے سمندر میں
یہ جو شرنارتھی سے چپٹے ہیں
نیم جاں کھوکھلے درختوں سے
رخ ہوا کا ذرا جو بدلے گا
یہ درخت آگ بن کے بپھریں گے
ان درختوں سے اب نہ رکھ امید
بھاگ اے بندروں کی نسل جدید

سنہ ۶۳ء

سفر

دور تک ہے غبار کا عالم
جیسے کچھ خواب کچھ حقیقت ہے
دل کے سمٹے ہوئے سے دامن میں
غم کی بدلی ہوئی سی صورت ہے
کچھ خیالوں کی آمد آمد ہے
کچھ امیدوں کا وقتِ رخصت ہے
دھیما دھیما سا شور اٹھتا ہے
کسی گزرے ہوئے زمانے سے

انتظار

پتھروں کی زمین کے اس پار
سبز پیڑوں کے شامیانے سے
دور ہٹتی ہوئی سفر کی حدیں
ساتھ چلتے ہوئے فسانے سے

٦٣ء

مناجات

اے خدائے دو جہاں تیری ثنا
کب کسی بندے سے ممکن ہے بھلا
تو ہے خلّاقِ جہانِ خاک و آب
مالکِ سیّارگان بے حساب
یہ زمیں کی وسعتیں یہ کوہسار
تیری صنّاعی کے ادنیٰ شاہکار
تیری رحمت گر نگہبانی کرے
مورِ مسکیں بھی سلیمانی کرے

ظالموں کو تو نے بخشا اے کریم
مطرب و ساقی و صہبا و ندیم
تاکہ جوشِ عیش میں سرشار ہوں
تیری دوزخ کے لیے تیار ہوں
دولتِ دنیا انھیں اندھا کرے
عاقبت کے ڈر سے بے پروا کرے
ان کے مستقبل پہ تیری مُہر ہے
چشم و گوش و دل پہ تیری مُہر ہے
شکر ہے مجھ کو نہ یہ لعنت ملی
علم کی ایمان کی دولت ملی
اپنی قسمت میں جو پستی ہے تو کیا
رات دن کی فاقہ مستی ہے تو کیا
تیری رحمت کا حسیں وعدہ تو ہے
انتظارِ شاہدِ فردا تو ہے

نامہ فرسائی کیے جاتا ہوں میں
زہر پی پی کر جیے جاتا ہوں میں
راہِ فن میں زندگی کا ہوش کیا
شاعروں کو فکرِ خورد و نوش کیا
نفس کو اپنے کچلنا چاہیئے
دوسروں کے غم میں جلنا چاہیئے
شکر کے سجدے میں ہے میری جبیں
اہلِ دولت کا مجھے شکوہ نہیں
لیکن اے فرماں روائے ابر و باد
تیری دُنیا میں ہیں کچھ عالی نژاد
ایسے دولت مند جو محسن بھی ہیں
یہ، جو کچھ موسیٰ بھی کچھ قارون بھی ہیں
یہ، بقولِ خود جو ہیں دانائے راز
صاحبانِ خود فریب و خود نواز

یہ سخن ناسنج شاعر ناشناس
خونِ علم و فن جنھیں آیا ہے راس
کس لیے اے خالقِ لیل و نہار
میری محنت پر ہے ان کا اختیار
پیٹ کے بندوں کو دل کی کیا خبر
گم ہے اپنی ذات میں اِن کی نظر
یہ تو ہیں ہر درد و غم سے بے نیاز
اِن کو کیا معلوم جینے کا گداز
دن کے نالے رات کی تنہائیاں
آرزوؤں کی خیال آرائیاں
رات کی جاگی نگاہوں کا خمار
فکر میں ڈوبی طبیعت کا اُتار
یہ مآل اندیش یہ اہلِ خرد
عِلم و فن کی آبرو سے نابلد

یہ بظاہر علم و فن کے پیشوا
کب تلک ہوں گے مرے حاجت روا
ان کے در پہ کب سے ہوں بیمار دیکھ
آہ میری زردئ رخسار دیکھ
سر بہ زانو ہے غرورِ عاشقی
جاں بلب ہے شیوۂ مردانگی
علم و فن کی آرزو کا خوں نہ کر
اے خدائے میرؔ و غالبؔ یوں نہ کر
علم و فن کو ضد ہے ہر پندار کی
آبرو رکھ لے مرے انکار کی
ذہن سے سودائے آزادی نہ لے
اس اندھیرے میں افق تابی نہ لے
جب تلک آنکھوں میں دم ہو اے خدا
جب تلک ہونٹوں کو ہو تابِ نوا

دردِ دل سوزِ جگر باقی رہے
طاقتِ عرضِ ہنر باقی رہے
مارچ ۶۳ء